شورش کاشمیریؒ

بیاد: امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

جن کی زباں کے پھول تھے دُرہائے تابدار

تو نظیریؔ ز فلک آمدہ بودی چوں مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشاخت دریغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رولیں۔ بالآخر وہ بھی رخصت ہوگیا۔ جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک ایک آیت تھا۔ جس نے مرتے دم تک فقر و استغناء کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کا مجموعہ تھی۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا، جو ایک عہد تھا، ایک ادارہ تھا، ایک انجمن تھا، ایک تحریک تھا۔ غرض ایک ایسا محور تھا' جس کے گرد افراد ہی نہیں' محاسن بھی گھومتے تھے۔ وہ اس پائے کا خطیب تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اس کے حریف بھی مانتے تھے۔ اردو زبان نے اس مرتبے کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہوسکے گا۔

وہ ایک عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ بہتر برس کی عمر مستعار میں انہوں نے ۱۲ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بسر کئے۔ ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شاید ان کے ارادوں کی بابت شک رہا ہو مگر انہیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اس مدرسۂ فکر کے علمبردار تھے' جس کی بنیادیں محمد قاسم نانوتویؒ اور محمود حسنؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی' ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیونکر نکالی جاسکتی ہے۔ وہ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں...... اوّلاً انگریزی حکومت یہاں سے ختم کی جائے۔ ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے کرتے تختہ دار پر لٹک جاؤں۔

پھر ان کا دل عشقِ رسول ﷺ کی جلوہ گاہ تھا۔ حضور ﷺ کے عشق میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی یہ عشق تھا...... اس عشق ہی نے انہیں ختم نبوت کے عقیدہ کی پشتیبانی کا مجاہد بنا دیا پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستہ کا سفر کیا' اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتے رہے اور کئی لوگوں کو ان کی واضح حرکاتِ سفیہہ کے باوجود معاف کردیا۔ مگر دو چیزوں سے وہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ نہ ہوئے اور نہ انہوں نے ان کے معاملہ میں درگزر پسند کیا...... اوّل انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں کا دوستانہ، دوم ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''میں توشۂ آخرت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں'' اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ وہ یہی لے گئے ہیں۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم اور قائد و جماعت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ وہ خطابت و ضمیر کی سودا بازی کے بازار ہی سے نا آشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا گرد غبار پھینکا اور خود فروشوں نے الزامات کے چولہے سے چنگاریاں لے کر بارہا ان کی دستارِ فضیلت پر پھینکیں مگر وہ تہمتوں کے بازار میں سے کنکریاں کھاتے ہوئے نکل گئے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں سرخرو ہو گئے۔ ان شاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام ابن تیمیہؒ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر اشکبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کا احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔

شاہ جی کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امرتسر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پناہ گزیں ہوا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر اس میں رہا۔ بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات دے گیا۔ ایک ایسا شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کا خوف اور رسول ﷺ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو کبھی قصرِ اقتدار میں نہیں رہا، جس کو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا، جس کا سیم وزر کے بت خانوں میں ذکر تک مفقود تھا، جس نے ایک لحظہ کے لیے بھی اخباروں اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی، جو آخر وقت تک چٹائی پر بیٹھتا، لیٹتا اور سوتا رہا جو اس مقام پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا عکس تھا۔ اور جب اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو ایک اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور، لائل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دور افتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ ہم نے اپنے وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء و فضلاء آغوشِ لحد میں اتارے گئے لیکن شاہ جی کی میت کے گرد عشاق کا ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا...... فقرا و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا، اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدائیوں کا

قبیلہ ملک کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے' وہ کبھی پر نہ ہوگا۔خطابت بیوہ ہو گئی۔لوگ کبھی اس طرف سے گزریں گے تو دلوں سے ہوک اٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مردِ مجاہد صرصر بہ آغوش راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا۔جس کی نوا پیرائیوں پر قیاس ہوتا تھا کہ قرنِ اوّل کا کوئی غزوہ نقاب الٹ کر سامنے آ گیا ہے۔یا پھر لوگ غارِ حرا کے ارد گرد کھڑے ہیں۔قرآن اتر رہا ہے اور قند و نبات کی طرح گھلتا ہوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے لیکن:

اب وہ رعنائی خیال کہاں

شاہ جی نے لیلائے آزادی کی مانگ میں سیندور بھرنے کے لیے اپنا خونِ جگر فراہم کرنے کے لیے ہر مقام پر جس جرأت و ایثار کا ثبوت دیا ہے۔وقت کی رفتار صدیوں تک اس کا جواب پیدا نہ کر سکے گی۔وہ خطابت کے میدان کے ایک بے مثال شہسوار تھے۔اس برصغیر کے بہت سے آتش بیانوں نے شاہ جی سے ہی گفتگو کا سلیقہ سیکھا تھا۔وہ جب کسی محفل یا کسی اجتماع میں لب کشا ہوتے تو بادِ صبا رک رک کر اور آسمان کے ستارے جھک جھک کر ان کی جادو بیانی کا اثر دیکھا کرتے تھے۔حسین و جمیل تشبیہیں ان کی کنیزیں تھیں اور دلآویز استعارے ان کے خانہ زاد تھے۔ان کی موت سے عروسِ خطابت کے ماتھے کا جھومر گر گیا ہے:

خطیبِ اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لے میں سنا رہا ہے
سرِ چمن چہچہا رہا ہے، سرِ وغا مسکرا رہا ہے
میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے کوثر پہ شام ہوتے کوئی دیا جھلملا رہا ہے

(شاہ جی کے انتقال ۲۱/اگست ۱۹۶۱ء کو ہفت روزہ ''چٹان'' کا تعزیتی اداریہ)